تربیت کا قرآنی منہاج

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین

پروفیسر غلام نبی حیدر

ادارہ منہاج القرآن

۳۶۵۔ ایم ماڈل ٹاون : لاھور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب ——— تربیت کا قرآنی منہاج

خطاب ——— پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین ——— پروفیسر غلام نبی حیدر

نظر ثانی ——— علی اکبر قادری

کتابت ——— اصغر خورشید عالم

مطبع ——— منہاج القرآن پرنٹرز

اشاعت دوم ——— جنوری ۱۹۹۳ء

تعداد ——— ۳ ہزار

قیمت ——— ۷/ روپے

نوٹ:۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے ادارہ منہاج القرآن کے لئے وقف ہے

ناظم نشر و اشاعت

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وبارک وسلم

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۸۰/۱-۴ پی آئی ڈی، مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چھٹی نمبر ۲۰-۴-۸۷ جنرل وایم ۷۳-۹-۷۰/۴، مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء شمال مغربی سرحدی صوبہ حکومت کی چھٹی نمبر ۶۷-۲۴۴۱۱ این۔ا/اے ڈی (لائبریری)، مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں و کشمیر مظفر آباد کی چھٹی نمبر س ت/انتظامیہ ۹۲/۸۰۶۱-۶۳، مورخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں کے تمام کالجز اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نمبر شمار		صفحہ
	زندگی آزمائش ہے	۹
	لفظ مصیبت کے استعمال کی حکمت	۱۰
	انجام کی دو صورتیں	۱۲
	مفہوم تربیت	۱۳
	ابتلاء کا بنیادی سبب	۱۳
	زُیِّنَ کے استعمال میں کارفرما حکمت	۱۴
	محبت کے ارتقائی مدارج	۱۵
	حیاتِ انسانی میں ادوارِ ابتلاء کی بتدریج ترتیب	۱۵
	نفسانی شہوت کی محبت (پہلا درجۂ ابتلاء)	۱۶
	محتاط رہنے کا اہم ترین وقت	۱۷
	اولاد کی محبت (دوسرا درجۂ ابتلاء)	۱۹
	عمر کے ساتھ ساتھ آزمائش میں اضافہ	۲۰
	مال و دولت کی محبت (تیسرا درجۂ ابتلاء)	۲۲
	جاہ و منصب کی محبت (چوتھا درجہ ابتلاء)	۲۴
	فطرت بالفعل اور فطرت بالقوۃ	۲۵
	انسانی سیرت میں فطرت بالفعل اور فطرت بالقوۃ کا دخل	۲۷
	فطرت بالقوۃ کے داعیے	۲۸
۱	اقرارِ ربوبیت	۲۸

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۲	فجور و تقویٰ کا امتیاز	۲۹
۳	بصیرتِ نفس	۳۰
۴	امانت کی ذمہ داری کا احساس	۳۲
	فطرت بالقوہ کی نشوونما	۳۳
۱	نفس امارہ — پہلا مرحلہ	۳۴
۲	نفس لوامہ — دوسرا مرحلہ	۳۴
۳	نفس مطمئنہ — تیسرا مرحلہ	۳۵
	حرفِ آخر	۳۵

حرفِ تشکّر

۴ر جولائی ۱۹۸۸ء کو قائدِ تحریک نے جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کے طلباء اور اساتذہ سے تربیتی خطاب فرمایا۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کی تنگ دامانی نے قائدِ محترم کی اس انتہائی منفرد فکری گفتگو کو آگے نہ بڑھنے دیا۔ ان کا خیال تو تھا کہ اس دلچسپ مفید اور اہم موضوع پر مزید گفتگو ہوگی لیکن مصروفیات کے انبار نے آج تک ایسا موقع نہیں دیا کہ اس سلسلۂ کلام کو تکمیلی مرحلے تک پہنچایا جاتا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ مفکرِ اسلام پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہٗ نے اس مختصر سے تمہیدی خطاب میں انسانی فطرت کے داعیات کی ایسی جامع عکاسی فرمائی ہے جو اخلاقیات اور نفسیات کی بڑی بڑی کتب میں بھی اس طرح وضاحت کے ساتھ نہیں ملتی۔ حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل کو اتنے اچھوتے اور خوبصورت انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک طرف انسان کو مرحلۂ حیات پر احتسابِ نفس کا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف انسانی فطرت میں کارفرما نیکی اور بدی کی کشاکش کے قدرتی نظام کا علم۔

اس اہم اور قدرے محتاط موضوع پر خطاب کو مرتّب کرتے ہوئے ادارے کے انتہائی مخلص اور سرگرم تحریکی کارکن محترم پروفیسر غلام نبی حیدر صاحب نے کافی محنت کے ساتھ زبان و ادب کے مناسب استعمال سے موضوع کو مزید دلچسپ اور قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ ان کی اس کاوش پر ہم ان کے تہہ دل سے مشکور ہیں۔

الاحقر

علی اکبر قادری

ڈاکٹر فریدالدین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

ادارہ منہاج القرآن

۱۷ر ستمبر ۱۹۸۹ء

زندگی ایک آزمائش ہے

اللہ تعالیٰ نے انسانی موت وحیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے :۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک : ۲)

اللہ تعالیٰ نے (سلسلۂ) موت وحیات کو اِس لیے پیدا کیا ہے کہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے۔

گویا یہ دنیا دارُ الابتلاء ہے۔ اِنسان کو ہر لمحہ کسی نہ کسی کیفیّت میں مُبتلاء کر کے پرکھا جاتا ہے کہ وہ کیا عمل کرتا ہے آیا وہ اللہ کی عطا کردہ ہدایت پر گامزن رہتے ہُوئے کامیابی کی منزل کو پالیتا ہے یا وہ صراطِ مُستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ یہ کیفیّت جس کو قرآن ابتلاء کا نام دیتا ہے بالعمُوم ایسی حالت ہوتی ہے جس میں تکلیف اور مُشقّت کا سامنا ہو جس میں انسان کو پریشانی اور اذیّت سے گُزرنا پڑے۔ کیونکہ یہ ایک امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور مشکل کے بغیر آزمائش کا تصوّر ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ خُداوندی ہے :۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ط

اور ہم کسی قدر خوف اور بھُوک اور اموال اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے تمھاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے

لہ الملک، ۶۷ : ۲

وبشر الصبرین [1] والوں کو (خدا کی خوشنودی کی) بشارت سنادو۔

یہ ساری کیفیتیں مصائب و آلام سے عبارت ہیں۔ اِن میں اذیتیں اور پریشانیاں ہیں۔ رنج و ملال ہے۔ محرومیاں ہیں، چیزیں چھینی جا رہی ہیں۔ یہی درحقیقت اِبتلاء ہے۔ یہاں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے "کُمْ" کی ضمیر استعمال فرما کر یہ بات واضح کر دی کہ یہ ابتلاء اور آزمائش صرف مسلمانوں کے لیے ہے۔ کیونکہ وہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کو مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آزمانا چاہتے ہیں کہ وہ اِبتلاء کی ان کیفیات میں صبر و استقامت کے ساتھ راہِ ہدایت پر گامزن رہتے ہیں یا نہیں۔ جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے ان پر یہ کیفیات وارد تو ہو سکتی ہیں لیکن وہ چونکہ سرے سے ہدایتِ الٰہیہ کے ہی منکر ہیں لہٰذا ان کی آزمائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمانوں میں جو جتنا نیک ہو گا اُسی قدر اس کی آزمائش بھی زیادہ ہو گی۔ حتّٰی کہ اللہ کے محبوب بندوں کی اِبتلاء تو مصیبت کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا ارشادِ خداوندی کے اگلے حصّے میں فرمایا گیا:۔

اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ [2]

ان (ایماندار) لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔

لفظ مصیبت کے اِستعمال کی حکمت

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے جب

---

[1] البقرۃ ۲: ۱۵۵ [2] البقرۃ ۲: ۱۵۶ ۔

پانچ قسم کی ابتلاؤں کا ذکر کیا تو معاً بعد اگلے حصہ آیت میں مصیبت کا لفظ الگ استعمال کیا۔ یہاں بطورِ خاص اِس کلمے کے استعمال کرنے میں ایک حکمت کارفرما ہے، جس کے تحت یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی اِبتلاء مصیبت کے درجہ کو پہنچ جائے بلکہ مصیبت درحقیقت اِبتلاء کے شدید تر درجہ کا نام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی شخص کو شدید تر ابتلاء میں ڈالیں گے جو اللہ کے زیادہ قرب کا خواستگار ہوگا۔ پس جو شخص اِس قدر ابتلاء اور مُصیبت میں سے صبر و استقامت کے ساتھ گزر گیا وہ اللہ تعالیٰ کی خُوشنُودی اور رحمت کا مُستحق ہے۔ چنانچہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے اِن عظیم المرتبت بندوں کو خاص انعامات کی خوشخبری دیتے ہُوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

اُولَٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوَٰتٞ	یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی
مِّن رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٞۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ	مہربانی اور رحمت ہے اور یہی سیدھے
هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ [۱]	راستے پر ہیں۔

چُونکہ ابتلائیں پانچ تھیں۔ اِس لیے ان کا صِلہ یعنی صَلَوٰت بھی جمع کے صیغہ میں ارشاد فرمایا اور مُصیبت کے صِلے کے طور پر لفظ "رحمت" الگ اِستعمال فرمایا۔ گویا جو شخص جتنی زیادہ اِبتلاؤں میں سے گُزرے گا۔ اِس پر اللہ تعالیٰ کی صلوٰت اور مہربانیوں کے دروازے اسی قدر وا ہوتے جائیں گے۔ اور جو شخص درجۂ مُصیبت سے بھی صبر و استقامت کے ساتھ گزر گیا اسے اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی رحمت سے بھی بہرہ ور فرمائیں گے۔

آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُهۡتَدُونَ یعنی جو لوگ کامیابی کے ساتھ ابتلاء اور مصیبت میں سے گزر جاتے ہیں۔ وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ گویا ہدایت یافتہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ دورِ ابتلاءٗ

---

[۱] البقرہ ۲ : ۱۵۷

میں سے گزرا جائے۔

انجام کی دو صورتیں

اِنسان جب اِبتلاء سے گزرتا ہے تو اس کا انجام کامیابی کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے اور ناکامی کی صورت میں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ دونوں حالتوں کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ [1]

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے، پھر اس (کی حالت) کو پست سے پست کر دیا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کو "احسن تقویم" میں پیدا کیا ہے۔ پھر اس کی فطرت میں دو صفات ودیعت کر دیں۔ ایک صفت ملکوتیت ہے جو اچھائی کی طرف مائل کرتی ہے اور دوسری صفت بہیمیت ہے جو برائی کی طرف کھینچتی ہے۔ ان دونوں صفات کی طرف یوں اشارہ فرمایا:۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا [2]

پھر اللہ نے اِس (نفس) کو اس کی بُرائی اور نیکی الہام کر دی۔

جب انسان اِبتلاء سے گزرتا ہے تو صفتِ ملکوتیت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان کامیابی کے ساتھ اِبتلاء سے گزر جائے تاکہ وہ 'احسن تقویم' کے حال کو قائم رکھ سکے جب کہ صفتِ بہیمیت اِسے پستی کی طرف کھینچتی ہے اور اگر یہ صفت غالب آجائے تو انسان اِبتلاء میں ناکام ہو کر 'اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ' میں گر

---

[1] التین، ۹۵: ۴، ۵ [2] الشمس، ۹۱: ۸

جاتا ہے۔

مفہومِ تربیّت

اِنسانی تربیت کا معنی یہ ہے کہ اسے وہ طریقہ سُجھا دیا جائے جس سے اس کی صفتِ ملکوتیّت طاقتور اور صفتِ بہیمیّت کمزور پڑ جائے تاکہ وہ ابتلاء میں سے کامیابی کے ساتھ گُزر سکے۔ گویا دورِ اِبتلاء میں سے کامیابی کے ساتھ گزر جانا مقصدِ تربیّت ہے۔

اِبتلاء کا بُنیادی سبب

اِبتلاء و آزمائش میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے لیے ضرُوری ہے کہ اِنسان اس آزمائش کے سبب سے آگاہ ہو تاکہ وہ ان تمام امکانات کا تدارُک کر سکے جو اِسے کامیابی کے راستے سے ہٹا سکتے ہیں۔ اِنسانی اِبتلاء کا بُنیادی سبب درحقیقت چند فطری رغبتیں ہیں، جن کا ذکر قُرآن پاک میں یوں کیا گیا ہے:۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ [1]

لوگوں کے لیے دل کش بنا دی گئی ہے عورتوں سے شہوت کی مَحبّت اور بیٹوں (کی محبت) اور سونے چاندی کے ڈھیروں (کی محبت) اور نشان زدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی (کی مَحبّت)

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے چار مُحبّتوں کا ذکر بطورِ خاص فرمایا ہے:۔

---

[1] آل عمران، ۳: ۱۴

۱ : نفسانی شہوت کی محبّت۔

۲ : اولاد کی محبّت

۳ : مال و دولت کی محبّت

۴ : جاہ و منصب کی محبّت

آیت کا عمومی اسلوب علامتی SAMBOLIC ہے۔ نفسانی شہوت کا ذکر کرتے ہوئے مِنَ النِّسَآءِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ کیونکہ شہوت کا عمومی محل عورت ہی ہے لیکن اِس سے ہم جنسیّت کی نفی نہیں ہوتی۔ اولاد میں صرف بیٹوں کا ذکر ہے۔ حالانکہ بنات (یعنی بیٹیوں) سے بھی محبّت ہوتی ہے۔ لیکن محبّت کا عُنصر چُونکہ بیٹوں میں غالب ہے۔ اِس لیے ان کا ذکر کر دیا۔ یہاں بیٹیوں سے محبّت کی نفی نہیں ہے۔ اِسی طرح مال و دولت میں سونے چاندی کا ذکر کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی دو قیمتی دھاتیں عموماً انسان کے اِستعمال میں آتی ہیں۔ اور جاہ و منصب کے لیے خالص علامتی انداز میں نشان زدہ گھوڑوں، مویشیوں اور کھیتی کا ذکر کیا گیا ہے کیونکہ اُس زمانے میں یہ چیزیں جاہ و منصب اور مُعاشرتی وقار کی علامت سمجھی جاتی تھیں۔

زُیِّنَ کے اِستعمال میں کارفرما حِکمت

آیت میں لفظ زُیِّنَ کا اِستعمال بھی قابلِ غور ہے۔ محبّت تو بذاتِ خُود شدید طبعی میلان کا نام ہے۔ چہ جائیکہ اِس محبّت کو مزید مُزیّن اور دلکش بنا دیا جائے۔ یہاں وُضِعَ یا خُلِقَ کے الفاظ بھی اِستعمال کیے جا سکتے تھے۔ یعنی یہ چاروں محبّتیں اِنسانی فطرت میں رکھ دیں یا پیدا کی گئی ہیں مگر ان کے اِستعمال سے وہ مفاد حاصِل نہ ہوتا جو زُیِّنَ سے مقصُود ہے۔ درحقیقت جب کسی چیز کو زینت دے

جاتی ہے تو وہ حسین لگتی ہے۔ طبیعت اِس کی طرف راغب ہوتی ہے۔ آپ چاہے اِس کے خلاف لاکھ عقلی دلائل دیں۔ قرائن و شواہد سے سمجھائیں مگر طبیعت کا جُھکاؤ اسی طرف رہے گا۔ درحقیقت محبّت کا مُزیّن کیا جانا ہی ابتلاء کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہی وہ بُنیادی سبب ہے جو ابتلاء کا باعث بنتا ہے۔

مَحبّت کے چار ارتقائی مدارج

مَحبّت کے مُختلف درجے ہوتے ہیں۔ پہلے طبیعت میں کسی چیز کی طرف معمُولی سا جھکاؤ پیدا ہوتا ہے جسے مَیلان کہا جاتا ہے۔ پھر میلان بڑھتے بڑھتے رغبت کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر طلب پیدا ہوتی ہے۔ طلب بڑھے تو مَحبّت بن جاتی ہے۔ اور جب مَحبّت میں شدّت آجائے تو وہ مَحبّت شدید بن جاتی ہے۔ جسے معرُوف معنٰی میں جُنُون کہا جاتا ہے اور عِشق بھی اِس سے ملتا جُلتا درجۂ مَحبّت ہوتا ہے۔ بہرحال مَحبّت اُسی وقت ابتلاء کا باعث بنتی ہے، جب وہ مَحبّتِ شدید کے درجہ کو پُہنچ جائے اور وہ خُود مُزیّن ہو جائے۔

حیاتِ انسانی میں ادوارِ ابتلاء کی بتدریج ترتیب

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ قرآن نے چاروں مُحبّتوں کو جِس ترتیب سے بیان کیا ہے اسی ترتیب سے یہ چاروں مَحبّتیں انسانی زندگی میں پروان چڑھتی ہیں اس ترتیب کے مُطابق اگرچہ انسانی عُمر کی قطعی حدبندی تو نہیں کی جا سکتی مگر ترتیبِ زمانی بہرحال یہی کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب سے پہلے بچپن کا دَور ہے یہ قبل از ابتلاء معصُومیّت کا دَور ہوتا ہے۔ اِنسان کی ابتلاء اُس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ سِن بلُوغت کو پُہنچتا ہے۔ سِن بلُوغت کو پہنچتے ہی اسے سب سے

پہلے نفسانی شہوت کی محبّت میں مُبتلا کر دیا جاتا ہے۔ یہ پہلا دورِ ابتلاء اندازاً چودہ پندرہ سال کی عُمر سے لے کر پچیس تیس سال کی عُمر تک جاری رہتا ہے۔ جب انسان صاحبِ اولاد ہو جاتا ہے تو دُوسرا دورِ ابتلاء شروع ہو جاتا ہے جو چلتے چلتے تیسرے اور چوتھے دور میں منتقل ہوتا جاتا ہے۔ یہ چار ادوار دراصل ابتلاء کے درجات بھی ہیں۔ اِس لیے ہم آئندہ گفتگو میں ان درجاتِ ابتلاء کو مرحلہ وار بیان کرنا چاہتے ہیں۔

نفسانی شہوت کی محبّت (پہلا درجۂ ابتلاء)

سِن بلُوغت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اِنسان کو ہر قسم کی آزمائش، اِبتلاء اور اِمتحان سے پاک رکھا ہے۔ اِس دور میں وہ شریعت کا مُکلّف ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ معصُومیّت کا دور ہوتا ہے۔ جیسے ہی انسان بلُوغت کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو گویا آزمائش کا پہلا پرچہ یعنی حُبُّ الشہوات کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ قبل ازیں وہ شہوت سے بے خبر تھا۔ اب اس میں شہوانی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں، اس کی سوچوں اور خیالوں میں تبدیلی واقع ہونے لگتی ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں تغیُّر رُونما ہو جاتا ہے۔ وہ دُوسروں کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ اس رغبت میں اسے عجیب سی لذّت ملتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ جذبات عُروج پر پہنچ جاتے ہیں۔

عُمر کے ساتھ ساتھ اِن شہوانی جذبات کے پروان چڑھنے کی مُختلف صُورتیں ہیں آیت مذکورہ میں مِنَ النِّسَاءِ کے الفاظ بھی انھی صُورتوں میں سے ایک صُورت کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ فطری طور پر عمُوماً اِنسان جنسِ مُخالف کی طرف راغب ہونے لگتا ہے۔ کسی خوبصُورت صنفِ نازُک کو دیکھ کر دل فریفتہ ہونے لگتا ہے۔ پھر

اِس سے مُلاقاتوں کو جی چاہتا ہے۔ اگر جنسِ مُخالف کی طرف سے بھی ایسا ہی ردِّ عمل ہو تو یہ سلسلہ آگے چل نکلتا ہے۔ اگر جذبات کا بہاؤ بالفرض ہم جنسیّت کی طرف ہو جائے تو اپنے ہم عُمر یا اپنے سے کم عُمر کے نوخیز لڑکوں کی طرف دل مائل ہونے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبات کا یہ بہاؤ انتہائی خطرناک ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جذبات بسا اوقات اِس طرح پروان چڑھتے ہیں کہ انسان اِسے پاکیزہ محبّت سمجھ رہا ہوتا ہے۔ دراصل یہ بھی شیطانی حملے کی ارتقائی شکل ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں اُس وقت کھُلتی ہیں جب یہ پاکیزہ محبّت یکدم شہوت میں بدل جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور اکثر لوگوں کے لیے واپسی کا راستہ بھی مسدُود ہو جاتا ہے اور انسان دل کے ہاتھوں مجبُور ہو چکا ہوتا ہے۔

مُحتاط رہنے کا اہم ترین وقت

سِنِ بلُوغت میں قدم رکھنے کے بعد عمُوماً یُوں ہوتا ہے کہ انسان اپنے ہم عمُر دوستوں میں سے کسی ایسے دوست کی طرف زیادہ رغبت محسُوس کرنے لگتا ہے جو رنگ میں ذرا صاف ہو یا شکل وصُورت میں بہتر ہو۔ اِس کے ساتھ ایک گونہ طبعی میلان ہو جاتا ہے۔ اسے دُوسروں سے ملنے کی بجائے اس سے ملنے میں زیادہ خُوشی محسُوس ہوتی ہے۔ وہ اس سے مل کر اوّلاً لاشعُوری طور پر جذبات کی تسکین پاتا ہے۔ وہ نہ ملے تو طبیعت پریشان سی رہتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ دوستی ہے، محبّت اور پیار ہے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اِس لیے اس وقت اس کے دل میں کوئی منفی خیال، کوئی بُری خواہش یا کوئی بُرا ارادہ ہرگز نہیں ہوتا بلکہ پاکیزہ خیالات سے اس کے جذبات کی تسکین کا آغاز ہوتا ہے، اسے خبر نہیں ہوتی، کہ

یہ جذبات بالآخر شہوت میں بدل جائیں گے۔ وہ پاکیزہ جذبات کی رَو میں بہے جاتا ہے اِس کے جذبات زیادہ سے زیادہ قُرب کا تقاضا کرتے ہیں۔ جسمانی قُرب سے اِسے رُوحانی اور قلبی تسکین ملتی ہے۔ نیک خیالی کا مُغالطہ اسے آگے سے آگے دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ جب جِسموں کا قُرب بڑھتا ہے تو جسم کے لمس سے اندر کا شیطان جاگ اُٹھتا ہے۔ نفس میں ارتعاش پیدا ہونے لگتا ہے اور نفس کا ارتعاش جب بڑھتا ہے تو انسان جذبات سے اتنا مغلُوب ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے قابُو میں نہیں رہتے۔ جذبات بہک جائیں تو یہ شہوت کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ وہ اتنا مغلُوبُ الحال ہو جاتا ہے کہ اپنے آپ کو بچانا اُس کے بس میں نہیں رہتا۔ اِس منزل پر پہنچ کر بچ نکلنے والے لاکھوں اور کروڑوں میں اِکّا دُکّا ہوتے ہیں وہ بھی محض توفیقِ ایزدی سے۔

حضرت داتا گنج بخش فرماتے ہیں کہ میں کم و بیش دو سال تک اسی نوعیت کی مُصیبت میں مُبتلا رہا ہُوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس ابتلاء سے نکال دیا۔ مگر ہر کوئی داتا گنج بخشؒ، مادھولال حُسین یا خواجہ نظامُ الدّین اولیاءؒ تو نہیں ہو سکتا۔ اِس منزل پر پہنچنے سے پہلے آپ جِس سے پُوچھیں گے وہ سر پر قرآن رکھ کر کہے گا کہ مجھ سے قسم لے لیں میرے دل میں تو کوئی غلط ارادہ ہی نہیں۔ ان کی یہ قسم سچّی ہو گی۔ کیونکہ اس نے تو بُرے ارادے سے اِس راہ کا سفر ہی نہیں کیا۔ اسے اس راستے کے آئندہ مراحل کا علم ہی نہیں ہوتا۔ مگر قُرآن نے ان تمام مراحل کی نشاندہی کر دی ہے۔ زین للناس حب الشھوٰت کے الفاظ کی ترتیب تین درجوں کی نشاندہی کر رہی ہے۔ پہلا درجہ زینت کا ہے۔ یعنی آغاز میں کوئی بھلا لگنے لگتا ہے۔ پھر دُوسرے درجے میں یہ زینت مَحبّت میں بدل جاتی ہے اور آخر میں جا کر یہ مَحبّت شہوت کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ جب انسان

مرحلۂ زینت میں ہوتا ہے تو اس کے ارادے پاک ہوتے ہیں۔ وہ اس زینت کو حُسنِ فطرت اور مظاہرِ قدرت سے تعبیر کرتا ہے۔ جب درجۂ محبّت کو پہنچتا ہے تب بھی ارادے پاک ہوتے ہیں۔ مگر اسے یہ خبر نہیں ہوتی کہ 'زینت' نے جو اسے 'حُبّ' کے زینے تک پہنچا دیا ہے تو 'حُبّ' اس کو 'شہوت' کے زینے تک پہنچانے والی ہے۔ یہی درحقیقت آزمائش ہے۔ پس دانشمند وہ ہے جو زینت کے وقت ہی دیکھ لے کہ یہ کشش پیدا ہو رہی ہے۔ جان لے کہ میں پھنس رہا ہوں۔ یہاں وہ توبہ کر کے دل کو پاک کر لے اور اِس راستے کو چھوڑ دے تو آئندہ تمام خطرات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ دانش مندی نہیں کہ انسان اپنے آپ کو خود اس مشکل مرحلے میں پھنسائے اور یہاں سے کامیاب بچ نکلنے کی اُمید بھی رکھے۔ یہ تو بالکل اسی طرح ہے جس طرح کوئی شخص جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈالنے کے بعد کہے کہ اللہ کرے نہ جلے۔

اولاد کی محبّت (دوسرا درجۂ ابتلاء)

بلوغت میں پہنچ کر کچھ عرصے بعد جب انسان کی شادی ہو جاتی ہے تو پہلا دورِ اِبتلاء کافی حد تک ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے دَور میں کچھ پھنس گئے۔ کچھ بچ گئے۔ جس کا جو حال ہوا سو ہوا۔ اِس دور میں جس شہوت سے بچنا مقصود تھا شادی کے بعد اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کا سامان جائز طریقے سے فراہم کر دیتا ہے۔ لہٰذا شہوت کی ابتلاء بہت حد تک ماند پڑ جاتی ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کی اولاد ہوتی ہے تو وہ ابتلاء کے دُوسرے اور خطرناک ترین دَور میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب اولاد کی محبّت شروع ہو جاتی ہے۔ پہلے اولاد کے لیے کشش پیدا ہوتی ہے۔ پھر محبّت کا رُوپ دھار لیتی ہے اور بڑھتے بڑھتے حُبِّ شدید کے

درجہ کو پہنچ جاتی ہے۔ جب اولاد کی محبّت کا آغاز ہوتا ہے تو وہ ہرگز کوئی بُرائی نہیں ہوتی بلکہ بحیثیّت ماں باپ انسان کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اولاد سے محبّت کرے مگر شریعت نے ہر چیز کے لیے ایک حد مُقرر کر دی ہے۔ انسان کی آزمائش یہی ہے کہ وہ اس حد کے اندر رہتا ہے یا حد کو پھلانگ جاتا ہے۔ شریعت کا مدّعیٰ اور مقصد یہ نہیں ہے کہ ان محبّتوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے فطرت میں رکھ دی ہیں ان کو جڑ سے اُکھاڑ کر کون پھینک سکتا ہے۔ ایسا حکم تو خلافِ فطرت ہوگا۔ مگر ہوتا یُوں ہے کہ اولاد کی محبّت کا آغاز پاکیزہ جذبات سے ہوتا ہے۔ پھر جب شفقتِ پدری یا ماں کی ممتا بھڑکتی ہے تو جذبات میں تلاطُم آتا ہے۔ یہ محبّت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتّٰی کہ انسان اتنا مغلُوبُ الحال ہو جاتا ہے کہ بسا اوقات راہِ اعتدال سے بھی ہٹ جاتا ہے یہی اِس کی ابتلاء ہے۔ اللہ اور اُس کے رسُول صلّی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام کا جو راستہ دیا ہے۔ نیکی اور بدی کا جو فرق سمجھایا ہے، اور عزّت اور بے عزّتی کی جو راہ سُجھائی ہے وہ ایسے ہی مرحلوں کے لیے ہے جب اولاد کی محبّت شدید ہو جاتی ہے، تو انسان ان میں سے بہت سے اُمور میں بہک جاتا ہے اور وہ اولاد کی خاطر بعض ایسے کام کر گُزرتا ہے جو وہ اپنی ذات کی خاطر کرنا ہرگز پسند نہ کرتا۔ گویا اولاد کی محبّت شہوتِ نفس کی محبّت پر بھی غالب آجاتی ہے۔

عُمر کے ساتھ ساتھ آزمائش میں اخفاء

یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ انسان کی عُمر جُوں جُوں اوپر جاتی ہے اس کی ابتلاء خفی ہوتی جاتی ہے۔ کڑی اور مشکل آزمائش وہی ہوتی ہے جو مخفی ہو۔ اِنسان کو پتہ بھی نہ چلے اور وہ بہک جائے۔ جو چیز بالکل عیاں اور واضح ہو اور دیکھتے ہی پتہ چل جائے کہ یہ تباہی کی صُورت ہے تو بچنا آسان ہوتا ہے۔ آگ جل رہی ہو تو اس

میں کوئی ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ ہاتھ جل جائے گا۔ یہ اتنی بڑی آزمائش نہیں۔ اس کے برعکس راکھ کا وہ ڈھیر جو بظاہر بُجھا ہُوا نظر آرہا ہو مگر اِس کے اندر چنگاریاں جل رہی ہوں تو وہ زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ انسان اس کو راکھ سمجھ کر ہاتھ ڈالے گا تو ہاتھ جل جائے گا۔ پس معلوم ہُوا کہ فتنہ جتنا مخفی ہو اُتنا ہی آزمائش کے لحاظ سے کڑا ہوتا ہے۔ انسان کی عُمر میں جُوں جُوں پختگی آتی ہے آزمائش مخفی ہونے کے باعث کڑی ہوتی جاتی ہے۔ 'حُبُّ البنین' (اولاد سے محبّت) کی اِبتلا بھی مخفی ہونے کے باعث شہوت کی اِبتلا سے بڑھ کر ہے یہی وجہ ہے کہ انسان اولاد کی محبّت کے جوش میں ایسے ایسے کام کر گذرتا ہے جو پہلی عُمر میں ناپسند کرتا تھا۔ جنھیں پہلے وہ خُود غرضی اور مفاد پرستی سمجھتا تھا، اور انھیں گھٹیا اور ہیچ سمجھ کر نفرت کیا کرتا تھا۔ مگر محبتِ اولاد کے غلبے نے اُس کے تصوُّرات بدل ڈالے۔ اِسی لیے قرآن کہتا ہے:۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ [1] — بے شک تمھارے اموال اور اولاد ایک آزمائش ہیں۔

قُرآن کا اولاد کو فتنہ اور آزمائش قرار دینا اِس بات کا واضح ثبُوت ہے کہ اولاد سے کوئی گناہ بھی مُتعلق ہے۔ بظاہر اولاد سے محبت کرنا، اولاد کا خیال رکھنا، اور انھیں سہُولتیں بہم پُہنچانا کوئی ناجائز بات نہیں ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا فرض ہے مگر یہ فتنہ اس معنیٰ میں ہے کہ انسان اولاد کی محبت میں یوں بڑھتا چلا جاتا ہے کہ وہ اولاد کی خاطر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ جو اپنے لیے کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ بہُت سے لوگ رشوت لے آتے ہیں۔ غبن کر لاتے ہیں۔ دوُسروں کی حق تلفی کرتے ہیں

---

[1] التغابن : ۱۵

لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ دو سگی بہنیں اولاد کی خاطر اپنے ذاتی تعلق کو بھول کر لڑ پڑتی ہیں اور تعلّقات توڑ لیتی ہیں۔ بھائی بھائی کے مُقابلے میں آجاتا ہے۔ اولاد کی مَحبّت ایسی آزمائش ہے کہ انسان اپنی ذات کو بھی بھُول جاتا ہے۔ (میرے نزدیک) واقعۂ کربلا میں سیّدنا امام حُسین علیہ السلام کی عظمت اور ان کے صبر و استقامت کی اِنتہا یہ نہیں ہے کہ اُنھوں نے اپنے جسمِ اطہر پر ستّر سے بھی زیادہ زخم برداشت کیے بلکہ اس معرکۂ شہادت کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے علی اصغر اور علی اکبر رضی اللہ عنہما جیسے نونہال فرزندوں کو اپنے ہاتھوں پر شہید کرایا۔ یہ بجا ہے کہ آپ نے اپنا جسم ریزہ ریزہ کروالیا۔ تلواروں کے سائے میں سرِ انور سجدہ میں رکھا۔ گھوڑوں سے آپ کے جسم انور کو روندھا گیا۔ یہ سب ظلم و بربریّت ایک طرف، مگر آپ کے صبر و استقامت کا عُروج CLIMAX یہ ہے کہ سیّدنا علی اصغرؓ اور سیّدنا علی اکبر کو اپنے ہاتھوں پر شہید کروا کے بغیر آہ و بقا کے واپس لے آئے۔ کیونکہ انسان اپنے تن کے لیے وہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے جو اولاد کے لیے برداشت نہیں کر سکتا، وہ اپنی ذات کے لیے سو بار فاقہ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے مگر اولاد کا فاقہ اسے گوارا نہیں ہوتا۔ یہی حُبّ البنین کی اِبتلاء ہے۔ یہی پُل صراط کی طرح وہ نازک مرحلہ ہے۔ جہاں سے اِس طرح گزرنا ہوگا کہ اولاد کی محبّت کے تقاضے بھی اس طرح پُورے ہوں کہ وہ ظلم نہ کریں اور اللہ کی مُقرّر کردہ حدیں بھی نہ ٹوٹنے پائیں۔

مال و دولت کی مَحبّت (تیسرا درجۂ ابتلاء)

جُوں جُوں انسان کی عُمر بڑھتی ہے۔ وہ غیر محسُوس طریقے سے دُوسرے دورِ اِبتلاء سے تیسرے دورِ ابتلاء میں داخل ہوتا جاتا ہے۔ ہوتا یُوں ہے کہ جب

اولاد بڑھتی ہے۔ بچے بڑے ہونے لگتے ہیں تو ضروریات بڑھ جاتی ہیں وسائل کم ہوتے ہیں۔ وسائل کی کمی اور ضروریات کی زیادتی تقاضا کرتی ہے کہ انسان مزید مال و دولت حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرے۔ یہ اس کی جائز ضرورت ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا ہر فتنے کا آغاز جائز تصوّر سے ہوتا ہے۔ اگر پہلی نظر میں آگ نظر آ جائے تو کوئی اس میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ آزمائش یہی ہے کہ انسان کو جائز ضرورت کے تحت فتنے میں مُبتلا کیا جائے کہ وہ کیسے بچتا ہے۔

جب انسان حصُولِ رزق کے لیے تگ و دو کرتا ہے تو کسی کو تھوڑی تگ و دو سے اللہ تعالیٰ رزق دے دیتا ہے اور کسی کو زیادہ تگ و دو کرنا پڑتی ہے کسی کو زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو کم۔ رزق میں یہ تفاوت تو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی میں رکھا ہُوا ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ [1]

اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔

جب وہ حصُولِ رزق کی تگ و دو کرتا ہے تو یہ کشمکش تین طرح سے اس کے لیے آزمائش بن سکتی ہے۔

اوّلاً : اس کی جائز ضرورتوں کی جائز وسائل سے کفالت نہ ہو۔

ثانیاً : وہ اپنی ضرورتوں کو ناجائز حد تک بڑھا لے اور پھر جائز وسائل سے کفالت نہ ہو۔

---

[1] النحل: ۱۶، ۷۱

ثالثاً : وہ اپنے سے بہتر حال والے شخص کو دیکھ کر مُسابقت کا شکار ہو جائے۔

یہ ساری صُورتیں اس کے لیے بہت سارے نفسیاتی، معاشی اور سماجی مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ اِس صُورتِ حال میں مُبتلا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، کہ اب وہ کیسے اِس ابتلاء میں سے گزرتا ہے۔ آیا وہ اپنی ضرُوریات کو جائز حدُود کے اندر رکھتا ہے یا نہیں، اور ایسا کرنے کے بعد بھی اگر جائز وسائل سے کفالت نہ ہو تو وہ صبر، شکر اور توکّل کا دامن تھامے رہتا ہے یا نہیں ؟

صحابہ کرام، اہلِ بیت اور اولیائے کرام سب کی اِن چیزوں سے آزمائش کی جاتی رہی۔ صحابہ رضؓ پر کئی کئی دنوں تک فاقے آتے۔ وہ کبھی کھجوروں سے وقت بسر کرتے کبھی ستّو پی لیتے، اور کبھی جَو سے گزارہ کرتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد خُود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں ابتدائی چھ ماہ تک یہ حالت ہوتی کہ حضرۃ عائشہ فرماتی ہیں کہ اللہ بھلا کرے ان انصاریوں کا کہ چھ ماہ تک ان کی بکری کا دُودھ کبھی کبھی آتا تھا اور ہم اس پر پلتے تھے۔ الغرض صحابۂ کرامؓ کے ایسے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں جن میں آزمائشوں کا ذکر ہے۔

جاہ و منصب کی محبّت (چوتھا درجۂ ابتلاء)

جب انسان زندگی کا بہت سا دورِ کش مکش محنت اور تگ و دَو میں گزارتا ہے تو عُمر کے آخری حصّے میں جا کر اس کے دل میں جاہ و منصب کی طلب پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اقتدار چاہتا ہے۔ وہ مُعاشرے میں عزّت و وقار کا خواہشمند ہوتا ہے وہ سوچتا ہے کہ میں نے اتنی محنت کی ہے لہٰذا فلاں جاہ و منصب میرا حق ہے۔ وہ اس کی طرف راغب ہوتا ہے، وہ ان لوگوں سے اپنا موازنہ کرتا ہے

جنہوں نے اس جتنی محنت نہیں کی ہوتی مگر وہ اقتدار پر براجمان نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اسے اپنے استحقاق کا خیال اور بھی راسخ ہو جاتا ہے۔ اِس طرح ایک جائز خیال لے کر انسان آگے بڑھتا ہے۔ مگر یہی خیال جب طلب، حرص اور شدید محبت کی صُورت اختیار کر لیتا ہے تو سوچ میں توازُن نہیں رہتا۔ یہاں اس کی چوتھی آزمائش شرُوع ہو جاتی ہے جو پہلی تینوں آزمائشوں سے خفی تر اور شدید تر ہے۔ ریاکاری بھی اسی آزمائش کی ایک فرع ہے۔ اِنسان عبادت و ریاضت کرتا ہے تو دِل میں یہ خیال آتا ہے کہ میری عبادت جانی جائے۔ میں جتنا مُتّقی ہُوں لوگ مجھے اتنا متقی سمجھیں۔ میں جتنا عبادت گزار ہُوں لوگ مجھے اتنا عبادت گزار جانیں۔ میں نے جتنی محنت کی ہے اِس کا ظاہرًا صِلہ مجھے ملے۔ یہ اِبتلاء اتنی خفی اور شدید ہے کہ بسا اوقات انسان کو اس کا شعُور تک نہیں ہوتا اور وہ صراطِ مُستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔

فِطرت بِالفِعل اور فِطرت بِالقُوۃ

یہ چاروں فطری رغبتیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے انسان کی فطرت بالفعل کہلاتی ہے۔ یہ درحقیقت چار نفسانی داعیے ہیں جو انسان کے شعُور میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ انسانی تربیّت کا یہ معنٰی ہرگز نہیں ہے کہ ان فطری اور شعُوری داعیوں کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔ ایسا کرنا ناممکن اور خِلافِ فطرت ہے۔ اگر ان داعیوں کو کُلیتًا ختم کر دینا مقصُود ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کو انسانی فطرت میں ودیعت ہی نہ کرتا۔ پس اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ اولاد کی محبّت ختم ہو جائے تو یہ ظلم بن جائے گا کیونکہ شفقتِ پدری ہی تو وہ قوّت ہے، جس کے ذریعے اولاد کی پرورش اور تربیّت ہوتی ہے۔ جو اولاد کو نیک اور صالح بناتی ہے۔ اس کا اچھّا وارث اور اُجرًا و ذخرًا اُبناتی

ہے۔ اگر شفقتِ پدری یا ماں کی ممتا ختم ہو جائے تو دنیا کا سارا نظام تباہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس محبّت کے ذریعے جو اچھے نتائج پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ختم ہو جائیں اور زندگی اِنسانیّت نہیں بلکہ درندگی کا نمونہ بن جائے۔ اِسی طرح اگر شہوانی جذبات ختم کر دیئے جائیں تو خانگی زندگی اور تناسُل کا پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ مال و دولت کی محبّت کلیتًا ختم ہو جائے تو ساری معاشی جدّوجُہد سرد پڑ جائے۔ اور اگر جاہ و منصب کی محبّت ختم ہو جائے تو زندگی میں مُسابقت کا جذبہ اور سیاست و ریاست کا سارا نظام تباہ ہو جائے۔ درحقیقت یہ چاروں فطری داعیے انسان کی اجتماعی زندگی کے سماجی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی تشکیل کرتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک داعیہ بھی ختم ہو جائے تو کسی نہ کسی پہلو کی تشکیل نہ ہو پائے گی اور وہ حکمت فوت ہو جائے گی جس کی خاطر قُدرت نے اس داعیہ کو فطرتِ انسانی میں ودیعت کیا ہے یہی وجہ ہے کہ فطرت انسانی بذاتِ خود ان داعیوں کو ختم کرنے کی ہر کوشش کے راستے میں مزاحم ہوتی ہے۔ اِسی لیے اِسلام نے رہبانیّت کو پسند نہیں کیا کیونکہ رہبانیّت ان تقاضوں کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتی ہے۔ پس اگر کوئی شخص انسان کی لوحِ شعُور سے ان داعیوں کے نقوش بالکل مٹا دینا چاہے تو یہ اسلام کا طریقِ تربیّت نہیں ہوگا بلکہ رہبانیّت ہوگی۔ ——— انسان کی ابتلاء درحقیقت یہ ہے کہ فطرت بالفِعل اپنے ان داعیوں کی تکمیل بغیر کسی قید اور روک ٹوک کے چاہتی ہے۔ یہی بے قید تکمیل کی خواہش اجتماعی زندگی میں بگاڑ پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ اِسلام یہ چاہتا ہے کہ ان داعیوں کے لیے جواز و عدم جواز کی ایسی حد بندی کر دی جائے کہ اِجتماعی زندگی کے مُعاشرتی معاشی اور سیاسی پہلو بھی بطورِ اَحسن تشکیل پا سکیں۔ اور بے قید تکمیل کی خواہش سے جو بگاڑ جنم لیتا ہے۔ اس کا بھی سدِّباب کیا جا سکے۔

یہ چاروں داعیے چونکہ انسان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ لہٰذا ان کو خارج سے کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ خود انسان کی فطرت میں ہی کوئی ایسی قوت ہو جو ان داعیوں کو حدودِ جواز سے باہر نہ پھلانگنے دے اور بے قید تکمیل کی خواہش کو مُقیّد کر کے فطرت بالفعل کے تقاضوں کو منظّم اور منضبط کر سکے۔ عادلِ حقیقی نے انسان کو اس قوت سے بھی محروم نہیں کیا۔ بلکہ جس طرح انسان کے شعور میں چار نفسانی داعیوں کو ودیعت کر کے اس کی فطرت بالفعل ACTUAL NATURE تشکیل دی ہے اسی طرح اس کے لاشعور میں چار رُوحانی داعیے ودیعت کر کے اس کی فطرت بالقوۃ بھی تشکیل فرمائی ہے جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

انسانی سیرت میں فطرت بالفعل اور فطرت بالقوۃ کا دخل

جس طرح فطرت بالفعل سے شعوری تقاضے جنم لیتے ہیں اسی طرح فطرت بالقوّۃ سے لاشعوری تقاضے جنم لیتے ہیں۔ قرآن پاک کی سابق الذکر آیت (فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا) میں ان دونوں فطرتوں کی صراحت کر دی گئی۔ فجور انسان کی فطرت بالفعل کا تقاضا ہے اور تقویٰ فطرت بالقوّۃ کا تقاضا ہے۔ فطرت بالفعل سے انسانی شخصیّت کا نفسانی پہلو تشکیل پاتا ہے اور فطرت بالقوّۃ سے رُوحانی پہلو۔ پس اگر فطرت بالقوّۃ فطرت بالفعل پر غالب آ جائے تو انسانی شخصیّت ملکوتیّت میں بدل جاتی ہے۔ پھر انسان مسجودِ ملائکہ بن جاتا ہے۔ وہ پیکرِ خاک ہو کر بھی فرشتوں سے افضل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر فطرت بالفعل فطرت بالقوّۃ پر غالب آ جائے تو انسان احسنِ تقویم کا پیکر ہو کر بھی اسفل السافلین میں گر جاتا ہے اور حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔

فطرت بالفعل کو فطرت بالقوّۃ کے تابع رکھنے سے جواز و عدم جواز کی حد بندی قائم رہتی ہے۔ تقویٰ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ انسان حدِ جواز کے اندر رہتے ہوئے

فِطرت بالفِعل کے تقاضوں کو پُورا کرے۔ اِس حدِ جواز کو پھلانگنا فجُور کہلاتا ہے۔ پھر حدِ جواز کے اندر بھی مُختلف درجات ہیں، جو تقوٰی کی درجہ بندی کرتے ہیں۔ جو جس قدر احتیاط لازم رکھے گا اُسی قدر تقوٰی کا اعلیٰ درجہ پالے گا۔

فطرت بالقوّۃ چُونکہ انسان کے لاشعُور میں ودیعت کی گئی ہے۔ اِس لیے اِسے نشوونُما دے کر شعُور میں لانا پڑتا ہے۔ جب تک یہ نشوونما نہیں پاتی اس کا وجود اور عدم برابر رہتا ہے۔ اِنسانی تربیّت سے مقصُود بھی یہی ہے کہ فطرت بالقوّہ کو نشوونما دے کر اتنا طاقتور کر دیا جائے کہ وہ فطرت بالفعل کے داعیوں کو حدُودِ جواز کے اندر رکھ سکے، تاکہ انسان "احسنِ تقویم" کی حالت پر قائم رہے۔ وگرنہ وہ کسی وقت بھی حدودِ جواز کو پھلانگ کر 'اسفل سافلین' میں گر سکتا ہے۔

فطرت بالقُوّۃ کو نشوونما دے کر شعُوری سطح پر لانے کے لیے ضروری ہے، کہ اس کے چاروں داعیوں سے آگہی حاصل کی جائے۔ وہ داعیے یہ ہیں :-

فطرت بالقُوّۃ کے داعیے

قُرانِ پاک کے مُطالعہ سے معلُوم ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت بالقوۃ حسبِ ذیل چار داعیوں کی جامع ہے :-

۱ : اقرارِ رُبوبیّت

اِنسان پیدائشی طور پر خالقِ کائنات کی رُبوبیّت و الوہیّت کے احساس سے بہرہ ور ہے اور اِس کے اقرار کی طرف طبعًا راغب بھی ہوتا ہے۔ قرآن پاک نے اِس داعیے کو عالمِ ارواح کے "مُعاہدۂ الست" کی صُورت میں یُوں بیان کیا ہے :-

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا (اللہ تعالیٰ نے پُوچھا) کیا مَیں تمھارا ربّ

بلیٰ [1] نہیں ہُوں ؟ سب نے جواب دیا
کیوں نہیں (تُو ہی ہمارا ربّ ہے۔

انسان خواہ کسی بھی مُعاشرے میں جنم لے۔ کفر و الحاد سے لبریز ماحول میں پرورش پائے، اس کے لاشعُور میں کسی "بڑی قوّت" کے ہونے کا اِحساس بہرحال موجُود ہوتا ہے۔ مُختلف زمانوں میں اِسی فِطری تقاضے نے انسان کو مظاہرِ قُدرت کے سامنے جُھکا دیا۔

جب انسان کفر و شرک کی آلودگیوں سے نِکل کر پروردگارِ حقیقی پر ایمان لے آتا ہے۔ تو یہ داعیہ نشوونُما پا کر سطحِ شعُور پر آجاتا ہے۔ پھر انسان اُس پروردگارِ حقیقی کی خوشنودی کا طلب گار ہوتا ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ وہ ایسے کام کرے جِس سے اُس کا ربّ خُوش ہو۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہش میں اتنی اِستعداد ہے کہ وہ فطرت بالفعل کے تقاضوں کی بے قید تکمیل کی خواہش کو کنٹرول کر سکے۔

۲ : فجُور و تقویٰ کا اِمتیاز

یہ انسانی فطرت کا دوسرا داعیہ ہے۔

انسان میں کسی "بڑی قوّت" کے اِحساس کی طرح اچھّائی، بُرائی اور خیر و شر کے درمیان فرق کرنے کا داعیہ بھی پیدائشی طور پر موجُود ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس امر کی طرف اِس طرح اشارہ کیا گیا ہے :-

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا [2]

پس اللہ تعالیٰ نے نفسِ انسانی کے اندر بُرائی اور اچھائی دونوں کا شعُور ودیعت کر دیا

---

[1] الاعراف : ۷، ۱۷۲ [2] الشمس، ۹۱ : ۸

اِنسان جس قسم کے مُعاشرتی تصوّرات و مُعتقدات میں پرورش پاتا ہے۔ اسی کے مُطابق خیر و شر کے معیاراتِ اِمتیاز مُتعیّن کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض تغیّر ناپذیر اخلاقی اقدار کو انسان تاریخ کے ہر دور میں برابر تسلیم کرتا چلا آیا ہے۔

جب انسان اپنے پروردگارِ حقیقی پر ایمان لے آتا ہے تو اس کی خوشنودی کے حُصُول کی خواہش خیر و شر کے معیاراتِ امتیاز کو بھی اپنے تابع کر لیتی ہے۔ پھر وہ خیر و شر کے پیمانے احکامِ الٰہیّہ کے اوامر و نواہی کے تحت مُتعیّن کرتا ہے۔ امر کا واجبُ التّعمیل اور نہی کا واجبُ الاجتناب ہونا اس کے نزدیک خیر اور اس کے برعکس شر بن جاتا ہے۔ چُنانچہ یہ داعیہ نشو و نُما پا کر فطرت بالفعل کے داعیوں پر احکامِ الٰہیّہ کی قائم کردہ حد بندی کو قبُول کر لیتا ہے۔

۳: بصیرتِ نفس

یہ تیسرا داعیہ بھی اِنسان کی خِلقت میں موجُود ہے۔ خیر و شر میں امتیاز کے باعث انسان اپنی ذات کا خُود مُحتسب ہے۔ وہ خُوب جانتا ہے کہ وہ عملِ خیر سرانجام دے رہا ہے یا شر کا مُرتکب ہو رہا ہے۔ قُرآن پاک میں اس داعیے کا یوں ذکر کیا گیا ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَهٗ [1]	بلکہ انسان اپنے نفسی اعمال پر خوب نظر رکھتا ہے چاہے عُذر و مَعذرت کرتا رہے۔

بصیرتِ نفس کے داعیے سے ہی اعمال کے کسب و ارتکاب میں انسان کے

---

[1] القیٰمۃ ۷۵: ۱۴، ۱۵

صاحبِ ارادہ و اختیار ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ خیر و شر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے میں آزاد نہ ہو تو بصیرتِ نفس بے معنی ہو جاتی ہے۔ احکامِ الٰہیہ کو قبول کرنے سے انسان میں بصیرتِ نفس کا داعیہ نشوونما پا کر اسے اپنے اعمال کے نفع و نقصان کا شعور بخشتا ہے۔

جب انسان بصیرتِ نفس سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو وہ اپنے احوالِ نفسانی سے ہمہ وقت آگاہ رہتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ نفس میں کس کس راستے سے کیا کیا چیز گزرتی ہے۔ کہاں جا کر فتنہ بن جاتی ہے۔ کہاں تک چھپ کر چلتی ہے، کہاں بگاڑ آتا ہے، کس طرح اصلاح ہوتی ہے۔ کیسے تباہی ہوتی ہے کیسے بچاؤ ہوتا ہے۔ الغرض بصیرتِ نفس کے باعث وہ فساد انگیز احوالِ نفس کا بروقت سدِباب کر سکتا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں جیسے کسی بچے کو سردی لگنے یا برف کا ٹھنڈا پانی پینے یا کھٹی چیز کھانے کے باعث ہلکا سا زکام ہو گیا اور آواز میں معمولی سا فرق پڑ گیا ہو۔ کسی نے پروا کی، کسی نے نہ کی۔ پروا نہ کرنے سے گلے میں خراش سی پیدا ہو گئی۔ پھر چھینکیں اور کھانسی ہونے لگی۔ پھر بھی اہمیت نہ دی اور یہی سمجھا کہ معمول کی بات ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر رفتہ رفتہ مرض بڑھ گیا اور انفیکشن ہو کر کھانسی اور نزلہ شدید تر ہو گیا۔ سر درد اور بخار رہنے لگا۔ جسم میں کمزوری لاحق ہونے لگی۔ اس مرحلے پر پہنچ کر علاج کیا تو کتنے انجیکشن اور دوائیاں استعمال کرنا پڑیں گی تب جا کر افاقہ ہو گا۔ اس کے برعکس جس نے ہلکا سا زکام ہوتے ہی مرض کو بھانپ لیا اور اسی دن ایک چمچہ سیرپ لے لیا تو مرض وہیں کنٹرول ہو جائے گا۔

بصیرتِ نفس کا مطلب یہی ہے کہ انسان ہر گھڑی اپنے احوالِ نفس اور کیفیاتِ نفس کی جانچ پڑتال کرتا رہے۔ نفس کے رجحانات سوچوں اور خیالوں پر نگاہ رکھے تاکہ ہر وہ خیال یا رجحان جو آگے جا کر برائی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اس کو وہیں

دبا دیا جائے، تاکہ وہ ایسی بُرائی کی صُورت اِختیار نہ کرنے پائے جس کا علاج مشکل ہو جائے۔

حضُور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی بارگاہ میں ایک صحابی حاضر ہُوئے۔ عرض کی، کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبُوب عمل کیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے اس کے نفس پر توجّہ فرمائی اور دیکھا کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ ارشاد فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔[1] یہی سوال کسی اور وقت میں دُوسرے صحابیؓ نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ محبوب عمل کیا ہے۔ تو آپؐ نے اس کے نفس پر توجّہ کر کے اس کی خرابی کو دیکھا تو ارشاد فرمایا اللہ پر ایمان اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔[2] اسی طرح کسی اور شخص نے یہی سوال کیا تو آپؐ نے اس کے نفس پر نگاہ ڈالنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ والدین کی اطاعت کرنا۔ سوال ایک تھا لیکن جواب الگ الگ ہونے کی حکمت یہ تھی کہ جس کے نفس میں جیسی خرابی تھی ویسی اصلاح فرمادی۔

۴: امانت کی ذمّہ داری کا احساس

اِنسان کو فاعلِ اخلاق کے منصب کی امانت سے نوازا گیا ہے۔ یہ امانت خیر و شر کے درمیان امتیاز کی بناء پر جدّ و جُہد کے ذریعے اخلاقی کمال کے حصُول سے عبارت ہے اور اسی کا نام 'خلافتِ الٰہیّہ' ہے۔ جو لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا سے مُتحقّق ہوتی ہے۔ اِس کی ذمّہ داری کا احساس بھی اس کے اندر خلقی طور پر موجود ہے۔ جس کے باعث وہ خُود کو اپنے اعمال پر کسی نہ کسی سطح پر جوابدہ ضرُور سمجھتا ہے۔ وہ کبھی بھی افعال سے بری الذّمہ نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ

---

[1] صحیح البخاری، ۱: ۷۶ فی کتاب مواقیت الصلوٰۃ باب فضل الصلوٰۃ لوقتھا

[2] صحیح البخاری، ۱: ۳۴۲ فی کتاب العتق باب ای الرقاب افضل

"فلسفہ جبریت" کا سہارا لے کر خود کو اخلاقی ذمہ داری سے بری قرار دینا چاہتے ہیں اگر ان کے دل و دماغ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت ظاہر ہو گی کہ وہ بھی خود کو ان فلسفوں کے سہارے اپنے اعمال کے نتائج سے بری الذمہ تصوّر نہیں کرتے۔ انھیں اپنے ان خود ساختہ فریب ہائے فکر و نظر کی اصلیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کاوشیں محض اپنے گناہ و معصیت سے لبریز کردار پر پردہ پوشی کی غرض سے ہوتی ہیں۔ ورنہ ان کا حقیقت سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا۔ بنابریں انسان کے ضمیر سے یہ ندا اُٹھتی ہے :-

فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَ أَنَا بَرِيءٌ مِمَّا تُجْرِمُونَ [1]

پس میرے جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور میں تمھارے جرائم سے بری الذمہ ہوں۔

متذکرہ بالا چار احساسات ہر انسان کے اندر خلقًا موجود ہیں اور انھی کے مجموعے کا نام "فطرت بالقوّۃ" ہے۔ جسے فطرت سلیمہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف حدیثِ رسول میں واضح اشارہ کیا گیا ہے :-

كُلُّ مَوْلُودٍ يُّوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ [2]

ہر بچّہ فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے۔

فطرت بالقوّۃ کی نشوونما

فطرت بالقوّۃ تعلّق باللہ کی مضبوطی سے نشوونما پاتی ہے، اور تعلّق باللہ احکام الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے سے مضبوط ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت بالفعل اپنے چاروں تقاضوں کی بے قید تکمیل چاہتی ہے جبکہ احکامِ الٰہیہ (اوامر و نواہی) اس بے قید

---

[1] ہود، ۱۱ : ۳۵ [2] مسند امام احمد، ۲ : ۲۳۳

تکمیل کی خواہش پر حد بندی قائم کرتے ہیں۔ اِس سے انسان میں فرض اور خواہش کا تضاد پیدا ہوتا ہے۔ فرض حکمِ الٰہی کی تعمیل کا تقاضا کرتا ہے اور خواہش (فطرت بالفعل) ادائیگی فرض کے راستے میں مزاحم ہوتی ہے۔ چنانچہ فطرت بالقوّۃ حرکت میں آکر احساسِ فرض کو اُجاگر کرتی ہے تاکہ تعمیلِ حکم میں کوتاہی نہ ہونے پائے اس طرح فرض اور خواہش کی مُسلسل کش مکش سے فطرت بالقُوّۃ حرکت پذیر رہتی ہے اور اِنسان جتنا زیادہ احکامِ الٰہیّہ پر کاربند رہتا ہے اسی قدر فطرت بالقوّۃ نشوونما پاکر مضبُوط ہوتی جاتی ہے اور شعُوری سطح پر آجاتی ہے۔

فطرت بالقوّۃ کی نشوونما کو تین اہم مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جن کی اپنی جُداگانہ کیفیّات ہیں۔ ان مراحل کے نام قرآنی اصطلاحات کے مُطابق نفسِ امّارہ نفسِ لوّامہ اور نفسِ مُطمئنہ ہیں۔

نفسِ امّارہ (پہلا مرحلہ)

اِس مرحلہ میں فطرت بالقُوّۃ کالعدم اور فطرت بالفعل غالب ہوتی ہے۔ لہٰذا اِنسان خواہشات کی بے قید تکمیل چاہتا ہے۔ نفسِ امّارہ کی کیفیّت یہ ہے کہ یہ انسان کو بُرائی (حکمِ الٰہی کی عدم تعمیل) پر برانگیختہ کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ — بے شک نفس تو انسان کو برائی ہی سکھاتا ہے۔[1]

نفسِ لوّامہ (دُوسرا مرحلہ)

اِس مرحلہ میں فطرت بالفعل اور فطرت بالقوّۃ مساوی القُوّت ہوتی ہیں۔ لہٰذا عزم کی کمی بیشی کے نتیجہ میں کبھی فطرت بالفعل غالب آجاتی ہے اور کبھی فطرت

---

[1] سورۃ یوسف، ۱۲ : ۵۳

فطرتِ بالقوّۃ۔ نفسِ لوّامہ کی کیفیت یہ ہے کہ اگر کبھی فطرت بالفعل کے غلبہ سے انسان بدی کا مُرتکب ہوتا ہے۔ تو فطرت بالقوّۃ میں موجُود نیکی (حکمِ الٰہی کی تعمیل) کا شعُور اسے ملامت کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ [1]

اور میں قسم کھاتا ہوں اُس نفس کی جو بُرائی پر ملامت کرے

نفسِ مُطمئنہ (تیسرا مرحلہ)

اِس مرحلہ میں فطرت بالقُوّۃ غالب آکر فطرت بالفعل کو اپنا مطیع کر لیتی ہے۔ جس سے فطرت بالفِعل کے تقاضے منظّم و مُنضبط ہو جاتے ہیں اور انسان احکامِ الٰہیّہ کی قائم کردہ حد سے تجاوُز نہیں کرتا۔ نفسِ مُطمئنّہ کی کیفیّت یہ ہے کہ انسان نیکی سے اطمینان پاتا ہے اور بُرائی سے نفرت کرتا ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے رب سے اور اس کا رب اس سے راضی ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [2]

اے وہ نفس جس نے اطمینان حاصل کر لیا تو اپنے رب کی طرف واپس چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔

حرفِ آخر

نفسِ امّارہ سے نفسِ مُطمئنہ تک پُہنچنے کا سارا دَور، دَورِ ابتلاء ہے، جس سے گُزرتے ہُوئے انسان کو بے شُمار مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر

---

[1] القیامۃ، ۷۵: ۲ [2] الفجر، ۸۹: ۲۷، ۲۸

رضائے الٰہی کی طلب صادق ہو تو انسان تمام کٹھن مراحل سے صبر و استقامت کے ساتھ گزرتا جاتا ہے تا آنکہ وہ منزلِ مُراد کو پالیتا ہے، جہاں ندائے ربّانی ان الفاظ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی ہے :-

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ
ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً
فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي
جَنَّتِي [1]

اے نفسِ مُطمئنہ! اپنے ربّ کی طرف اس حال میں لوٹ جا کہ تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پس تو میرے بندوں میں شامل ہو کر میری جنّت میں داخل ہو جا۔

---

[1] الفجر، ۸۹ : ۲۷ تا ۳۰